ماہنامہ

الحمراء

لاہور

ستمبر 2023



''نظم و نثر کے بے بدل خالق''

عذرا اصغر

احمد حسین مجاہد جانے کیوں فوجی لگتے ہیں اور وہ بھی پیدائشی فوجی۔ مجاہد کا لاحقہ والدین نے تو یقیناً نہیں لگایا ہوگا یہ خود انہی کی اختراع لگتا ہے لیکن اپنے اشعار میں تخلص احمد استعمال کرتے ہیں۔ میں نے کہا ہے نا کہ وہ نام سے فوجی لگتے ہیں مگر ذاتی طور پر نرم و نازک جذبوں کے مالک ہیں۔ تبھی تو ایسے نادر قسم کے شعر کہہ پاتے ہیں:

وقت کی رفتار ہو جاؤں گا میں　　　اتنا پُراسرار ہو جاؤں گا میں
جیسے میرا خواب ہے یہ زندگی　　　جیسے اب بیدار ہو جاؤں گا میں

معروف سینئر شاعر محمد اظہار الحق نے ان کی شاعری کو ''نگارِ غزل کے ماتھے کا جھومر کہا ہے'' احمد حسین مجاہد کے بیشتر اشعار میں زعم بھی ہے اور انکسار بھی۔

جب چشمۂ تخلیق اُبل جاتا ہے　　　وجدان کہیں دور نکل جاتا ہے
انگلی پہ مری گھومنے لگتی ہے زمیں　　　سورج مری مٹھی میں پگھل جاتا ہے

میرے نزدیک شاعری پڑھنے سے زیادہ سننے کی چیز ہے لیکن جب ہم اساتذہ کو پڑھتے ہیں یا موجودہ اچھے اور سچے شعرا کو پڑھتے ہیں تو لطف اندوز ہوئے بغیر نہیں رہتے۔ احمد حسین مجاہد اپنی شعراء سے تعلق رکھتے ہیں۔ ورنہ بے ہنگم اور بے مقصد شاعری کا تو بازار لگا ہوا ہے۔ ناصر عباس نیر احمد حسین مجاہد کے سخن کے بارے میں کہتے ہیں۔ ''معاصر اُردو شعرا کے ازدحام میں چند شعرا ہی ہمیں متوجہ کرتے ہیں اور انہی میں ایک اہم نام احمد حسین مجاہد کا ہے۔''

شاعری سے میرا تعلق صرف پڑھنے اور سننے کی حد تک ہے۔ شاعری کی چند کتابیں ہی ایسی ہیں جنہیں میں نے پورا پڑھا ہے۔ ادبی جرائد میں چھپنے والی شاعری کا یہی حال ہے۔ ''اوک میں آگ'' بلامبالغہ پورا پڑھا جانے والا مجموعہ ہے۔ لفظ ''اوک'' کو مجاہد نے کیا نئے معنی دیے ہیں اور اس لفظ کو کئی اشعار میں باندھا بھی ہے۔

کسی نے آگ میں گوندھا ہے برسوں میری مٹی کو　　　بدن کے ریشے ریشے میں اک آئنہ چمکتا ہے
میں مسافر تھا طلب کرتا اگر آبِ حیات　　　اوک میں بھر کے مجھے آگ پلائی ہوتی
لے گیا کوئی رسالت، کوئی اعجازِ ہنر　　　میں نے اے کاش! اگر آگ ہی لائی ہوتی

یہ شعر بھی ملاحظہ کیجیے:

مگر وہ ہم تھے کہ لائے تھے اُس الاؤ سے آگ　　　وہاں سے راکھ تو اب کوئی جا کے لے آئے

''اوک میں آگ'' کے چیدہ چیدہ اشعار بھی درج کرنے لگوں تو کتاب نہ سہی ایک کتابچہ ضرور بن جائے گا۔ لیکن یہ دو شعر کیسے نظرانداز کر دوں؟

بس اک دیے کے سوا گھر میں کچھ نہ تھا احمد　　　اسے بھی سامنے ہم خود ہوا کے لے آئے
کرتے ہیں ایک تغافل شعار سے　　　ہم برف میں کچھ آگ ملائے ہوئے تو ہیں

اور یہ تین شعر میری مجبوری جانئے:

گملے ہیں سیڑھیوں پہ، دریچے پہ بیل ہے　　　چھوٹا ہے گھر، ہم اس کو سجائے ہوئے تو ہیں
پلٹ پلٹ کے مجھے دیکھتا تھا جاتے ہوئے　　　میں اس سے روٹھ گیا تھا اسے مناتے ہوئے
مجھے بھی دیکھتا ہے، دیکھتا ہوں میں کہ نہیں　　　مرے عدو کو وہ ظالم گلے لگاتے ہوئے

احمد حسین مجاہد شاعر ہیں اور شاعر کے طور پر ہی شہرت پا چکے ہیں لیکن شاید کم لوگ جانتے ہوں کہ وہ اعلیٰ درجے کے نثر نگار بھی ہیں۔ تحقیق و تنقید میں اپنی پہچان رکھتے ہیں اور کئی نثری کتابوں کے مصنف و مولف ہیں۔ ان کی سب سے اہم کتاب ''صفرِ

خاک" ہے۔ اگر وہ کچھ اور نہ بھی لکھتے تو "صفحۂ خاک" ان کے نام کو زندگی دینے کے لیے کافی تھی۔ "صفحۂ خاک" اس مشہور، ہیبت ناک زلزلے کا تفصیلی احوال ہے جو ۸ اکتوبر ۲۰۰۵ء میں آیا تھا جس نے کشمیر سے لے کر اسلام آباد تک کی بنیادوں کو ہلا ڈالا تھا۔ جبکہ بالا کوٹ مکمل طور پر تباہ ہو گیا تھا۔ بالا کوٹ میں وہی لوگ زندہ بچے تھے جو اس وقت بالا کوٹ سے باہر گئے ہوئے تھے یا ملبے سے نکالے گئے تھے۔ ظاہر ہے وہ زخمی تھے۔ ایسی صورت میں جو بچے تھے ان کے بچے نہیں رہے تھے اور جو بچے بچ سکے ان کے سروں سے والدین کا سایہ اٹھ چکا تھا۔ "صفحۂ خاک" لکھتے ہوئے احمد حسین مجاہد نے اہتمام یہ کیا ہے کہ اصل مقصد تک پہنچنے سے پہلے انہوں نے عہد بالا کوٹ کی تاریخ کو ایک عہد کی دستاویز بنا کر پیش کیا ہے۔ اس سلسلے میں وہ رقم طراز ہیں:

"بالا کوٹ کی آٹھ اکتوبر سے پہلے اور بعد کی تصاویر کے حصول کے لیے مجھے کئی مختلف ذرائع کو بروئے کار لانا پڑا۔ انہوں نے ۸ اکتوبر ۲۰۰۵ء کے اس المناک سانحہ کو کتابی شکل میں لا کر واقعہ کو زندہ جاوید کر دیا ہے اور ہم تفصیل سے اس سانحہ کی کہانی بلکہ حقیقت سے آگاہ ہوتے ہیں۔ جبکہ سنا ہے ۱۹۳۵ء میں ایسے المناک زلزلہ سے کوئٹہ تباہ ہوا تھا۔ مگر اس کی کوئی دستاویز نہیں تھی۔ کم از کم میری نظر سے نہیں گزری۔ اس ضمن میں احمد حسین مجاہد قابل تحسین ہیں بلکہ تاریخ اردو ادب پر ان کا یہ احسان ہے۔ وہ خود اس سانحہ سے گزرے۔ گھر زمین دوز ہوئے اور اعزا و اقربا شہید ہوئے۔ ان کا مندرجہ ذیل قطعہ اس کیفیت کا غماز ہے۔

پانی تھا میسر، نہ کفن تھا، نہ دعائیں — بے طور ہر اک پیر و جواں دفن کیا تھا
ملبے سے نکالے تھے کئی پھول، کئی خواب — اب یاد نہیں، کس کو کہاں دفن کیا تھا

مرزا غالب نے تو کہا تھا:

رہیے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو — ہم سخن کوئی نہ ہو اور ہم زباں کوئی نہ ہو
پڑیے گر بیمار تو کوئی نہ ہو تیماردار — اور اگر مر جائیے تو نوحہ خواں کوئی نہ ہو

غالب صاحب نے خواہش تو کی تھی مگر ایسے سانحوں سے گزرے نہیں تھے۔ بالا کوٹ کا زلزلہ دیکھ کر مجھے یقین ہے ان کی روح قفس جنت سے بھی کہیں پرواز کر گئی ہوگی۔

احمد حسین مجاہد کا درج بالا قطعہ اس کیفیت کا عکاس ہے۔ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ "صفحۂ خاک" تحریر میں لاتے ہوئے ان کو کس کرب سے گزرنا پڑا ہوگا۔ یعنی ؏ کیا کیا نہ ہمیں یاد آیا جب یاد تری آئی۔ جبکہ ہمارے جیسے قارئین ضبط گریہ ممکن نہیں رہتا۔ کتاب پڑھنے کے بعد میں سوچتی رہی ہوں کہ اگر آثارِ قدیمہ والے بالا کوٹ کے کسی حصے کی کھدائی کریں تو چھوٹی بڑی کھوپڑیاں اور ہڈیوں کے سوا کیا چیز برآمد ہوگی؟ آٹھ اکتوبر دو ہزار پانچ میں کراچی میں تھی۔ زلزلے کا احوال جان کر کئی لوگوں کی فون پر خیریت دریافت کرنے کی کوشش کی۔ مگر انسان سلامت نہیں رہیں تھے تو ٹیلیفونک سلسلہ کیسے بحال رہتا۔ بس امدادی سامان سے ہی اس سانحہ میں شرکت ہوسکی۔ چند روز بعد لاہور آئی تو شبہ بیٹی کے ساتھ میں بھی ہسپتال گئی۔ وہاں احمد حسین مجاہد کی قریبی عزیزہ اپنی ایک ٹانگ زلزلے کو بھینٹ کر کے بستر پر تھیں۔ اب جبکہ میں خود بالا کوٹ میں موجود ہوں تو دیکھتی ہوں جو بچہ میرا مددگار ہے اس کا پیر کے انگوٹھے کے بعد سارا پنجہ غائب ہے۔ اس کی والدہ، دو بڑے بھائی اور ایک بہن نے جان جانِ آفرین زلزلے کی نذر کر کے شہادت کا درجہ حاصل کیا۔ بلال پانچ سال کا تھا اس وقت جسے ملبے سے نکالا گیا تھا۔ "صفحۂ خاک" میں یوں تو کئی واقعات درج ہیں بلکہ پوری کتاب ہی مرثیہ ہے۔ مگر ایک واقعہ "بچے کو ماں نے اٹھایا اسکول جانے کے لیے۔ بچے نے کہا ماں سردرد ہے۔ اسکول نہیں جاؤں گا۔ ماں نے سردرد بہانہ سمجھا اور زبردستی اسکول بھیجا۔ بچہ کچھ کھائے پیے بغیر بستہ اٹھا کر اسکول وین میں بیٹھا۔ اس کی ماں آج تک اس کا ناشتہ لیے بیٹھی پچھتاوے کے ساتھ اس کی منتظر ہے۔ "اسے اپنے بیٹے کا مضمحل قدموں سے دروازے سے نکلنا کبھی نہیں بھول سکتا۔" کتاب میں سطر سطر پر ایسی ہی دلدوز کہانیاں ہیں۔ یہ کہانیاں، کہانیاں نہیں ہیں۔ بالا کوٹ کی تاریخ کا مرثیہ ہیں۔ "صفحۂ خاک" سے یہ پیراگراف دیکھیے:

"اب شام ہونے والی ہے اور مجھے زخمیوں کو ایبٹ آباد ہسپتال پہنچانا ہے۔ راستے مسدود اور ملبے سے اٹے ہوئے ہیں۔ گاڑی کا حصول محال ہے۔ مجھ میں اتنی سکت نہیں کہ میں سڑک تک پہنچنے میں زخمیوں کی کوئی مدد کرسکوں۔ ایسے میں اکھلی سے آئے ہوئے

ہمارے کچھ رشتے دار بروئے کار آتے ہیں۔ وہ زخمیوں کو اپنے کاندھوں پر اُٹھا کر سڑک تک لاتے ہیں۔ ہم لڑکیوں کے ہائر سیکنڈری اسکول کے قریب سے گزرتے ہیں۔ اسکول میں ہر طرف بچوں کے کھلے ہوئے بستے اور جوتے اِدھر اُدھر بکھرے پڑے ہیں۔ ہوا نہ جانے کس ادھوری تحریر کی تلاش ہے کہ وہ کتابوں اور کاپیوں کے صفحے اُلٹ رہی ہے۔ میں اس منظر کی تاب نہیں لا سکتا۔ مجھے لگا جیسے اس اُجڑی ہوئی بستی میں شامِ غریباں کا سماں ہے۔ مجھے لگا جیسے ع ہوا میں آنسو رُکا ہوا ہے، گھٹا میں سسکی تھمی ہوئی ہے۔ زلزلے کی شدت کو احمد حسین مجاہد یوں بیان کرتے ہیں:

''دفتر کے ساتھیوں سے ملنے اور ان کا حال احوال پوچھنے کے بعد میں جونہی اپنی نشست کی طرف بڑھا، اچانک ایک زوردار دھماکہ ہوا اور ایک خوفناک مسلسل گڑگڑاہٹ کے ساتھ جو میرے لیے بالکل اجنبی تھی۔ پوری عمارت بری طرح جھولنے لگی۔ میں راہداری میں جو بمشکل چھ سات فٹ چوڑی ہوگی۔ گاہے قریب آتی اور گاہے دور ہوتی در و دیواروں کے درمیان جیسے فٹ بال کی طرح لڑھکنے لگا۔ فوری طور پر مجھے یہ اندازہ نہیں ہو سکا کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ میں کسی طرح سیڑھیوں تک پہنچنے میں کامیاب ہوگیا۔ میرے ہاتھ سیڑھیوں کے ساتھ لگی ریلنگ پر مضبوطی سے جمے ہوئے تھے۔ مگر ایک سیڑھی سے دوسری سیڑھی پر پاؤں رکھنے کے لیے مجھے فضا میں جھولتے ہوئے اپنے جسم کو سنبھالنے میں دقت ہو رہی تھی۔ میرے پاؤں سیڑھیوں پر بے طرح پڑ رہے تھے اور مجھے ایسا لگتا تھا جیسے میں لڑکھڑا کر گر جاؤں گا۔ میں گیراج سے ہو کر دفتر کے عقبی دروازے کی طرف بڑھا کہ اسی راستے سے میں سڑک پر جلدی پہنچ سکتا تھا۔

ہر طرف گرد و غبار تھا۔ ابھی ہم سنبھل بھی نہ پائے تھے کہ زمین ایک بار پھر لرزنے لگی اور سڑک پر جہاں میں آلتی پالتی مارے بیٹھا تھا ایک لمبی اور گہری دراڑ پڑ گئی۔ دور پہاڑوں پر روئی کے گالے سے اُڑتے پھر رہے تھے اور گالوں نے زمین اور آسمانوں کے درمیان ایک پردہ سا تان دیا تھا۔

میرے بچے......! میری رگوں میں خون منجمد ہونے لگا۔ پھر جیسے کسی نے مجھے تسلی دی۔ میرے دل پر ہاتھ رکھا اور مجھے لگا جیسے سب خیریت سے ہیں:

میں گھر سے دور تھا، تنہا تھا، بے سہارا تھا   مجھے کسی نے بہت دور سے پکارا تھا

کہاں تک سنو گے، کہاں تک سنائیں۔ یہ داستان پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ بس اس شعر کے مطابق:

نمازِ عصر پڑھی تھی مکاں کے ملبے پر   تلاوتِ غمِ انساں میں دن گزارا تھا

کتاب کی عبارت ایک سو پینتالیس صفحوں پر مشتمل ہے۔ پھر کئی صفحات پر تصاویر ہیں۔ احمد حسین مجاہد صاحب نے ابواب تقسیم نہیں کیے لیکن ترتیب کچھ یوں بنتی ہے۔ قدیم تاریخ ''آٹھ اکتوبر ۲۰۰۵ء سے پہلے کا بالا کوٹ''، ''ایک حکایت''، ''نیا بالا کوٹ'' ''زلزلوں کی مختصر تاریخ''، ''روشنی، امن اور محبت کے سفیر''، صفحہ خاک کا دیباچہ معروف شاعر عامر سہیل (ایبٹ آباد) کا تحریر کردہ ہے۔ پھر احمد حسین مجاہد نے ''صفحہ خاک'' لکھنے کی وجہ تسمیہ اپنے خوبصورت اور مرصع لفظوں میں بیان کی ہے۔ ایک شاعرانہ پیش گوئی کے عنوان سے موصوف لکھتے ہیں:

''مجھے ٹھیک سے یاد نہیں کہ وہ غزل میں نے کب کہی تھی۔ جس کا ایک شعر زلزلے کے بعد دوستوں کی توجہ کا مرکز بنا لیکن یہ غزل پہلی بار شاید ۱۹۹۸ء یا ۹۹ء میں سہ ماہی ''نسطیر'' میں شائع ہوئی تھی۔ واحد سراج، عامر سہیل، شعیب آفریدی، احمد عطا اور اعجاز نعمانی کا خیال ہے کہ یہ ایک شاعرانہ پیش گوئی تھی جو آٹھ اکتوبر کی صبح سچی ثابت ہوئی۔ شعر یہ ہے:

زباں سمجھتا ہوں میں ٹوٹتے ستاروں کی   یہ شہر مجھ کو اُجڑتا دکھائی دیتا ہے

اس میں شک نہیں کہ سچی شاعری تو ہوتی ہی ہے الہامی۔ ورنہ ردیف قافیے کے ساتھ چند لفظوں کو جوڑ لینا تو بس تشفی قلب کے مترادف ہے۔ یہ مضمون نہ تنقیدی ہے اور نہ تحقیقی۔ یہ سراسر ناچیز کے تاثرات پر مبنی ہے۔ جو ''صفحہ خاک'' کے مطالعے کے وقت مجھ پر وارد ہوئے۔

چلو آؤ تم کو دکھائیں ہم، جو بچا ہے مقتلِ شہر میں   یہ مزار اہلِ صفا کے ہیں، یہ ہیں اہلِ صدق کی تربتیں